تصوّرِ عشق

علامہ محمد اقبال اور میاں محمد بخش کا تقابلی مطالعہ

عابدہ خاتون

علامہ اقبالؒ کے نظامِ فکر میں عشق کو ایک بنیادی مقام حاصل ہے۔ وہ عشق کو مقصد سے بے پایاں لگن کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ ایک ایسی لگن جو راستے میں آنے تمام والی مشکلات اور تکالیف کو خاطر میں نہیں لاتی بلکہ پوری قوت اور جدوجہد کے ساتھ منزل کی جانب اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:

> اقبال نے عشق کے مفہوم میں بڑی گہرائی اور بڑی وسعت پیدا کر دی ہے اور اس بارے میں وہ خاص طور پر عارفِ رومی کا شاگرد رشید ہے۔ اقبال نے حکمت و عرفان کے بیش بہا جواہر اسی مرشد سے حاصل کیے ہیں لیکن عشق کے بارے میں وہ خاص طور پر رومی کا ہم آہنگ ہے۔[1]

رومیؒ عشق کے علم بردار ہیں کیونکہ عشق ہی وہ قوت محرکہ ہے جو کائنات کے سربستہ رازوں تک انسان کی رہنمائی کرتی ہے۔ علامہ اقبالؒ بھی رومیؒ کے ہم نوا ہیں ان کے نزدیک عشق کی بدولت ایک نئی دنیا انسان کی نگاہوں پر منکشف ہوتی ہے۔ پروفیسر منور رؤف لکھتے ہیں: ''وہ سمجھتے ہیں کہ عشق کے ذریعے سے انسان کو وہ دانش نورانی اور بصیرت یزدانی حاصل ہوتی ہے جس سے کائنات کے راز ہائے سربستہ اس پر منکشف ہو جاتے ہیں اور وہ حقائق اشیا پر مکمل عبور حاصل کر لیتا ہے۔[2]

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نار حیات[3]

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دم بدم

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نَم[4]

علامہ اقبالؒ اور میاں محمد بخشؒ کے فلسفۂ عشق میں گہری مطابقت پائی جاتی ہے۔ دونوں دل کے سوز کے طلب گار ہیں اور عشق کو مقصد حیات سمجھتے ہیں۔ جب تک دل میں منزل کے حصول کی لگن نہ ہو انسان بلند نصب العین کو نہیں پا سکتا اور یہ تڑپ صرف عشق کی بدولت ہی حاصل ہوتی ہے۔ عشق ہی انسان کو اوجِ کمال تک پہنچاتا ہے اور حیاتِ ابدی سے ہم کنار کرتا ہے۔ عشق نورِ حیات ہے اور نور کا منبع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ جب تک دل اصل سرچشمے کی روشنی سے منور نہ ہو، حقائق کا ادراک ممکن نہیں، اس لیے اپنے دل میں عشق کا روشن چراغ جلانے کے لیے میاں محمد بخشؒ اللہ تعالیٰ سے یوں دعا کرتے ہیں:

بال چراغ عشق دا میرا روشن کر دے سیناں
دل دے دیوے دی روشنائی جاوے وچ زیناں[۵]

علامہ اقبالؒ بھی عشق کی لازوال کسک کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوتے ہیں

کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو
یا رب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو[۶]

عشق مجازی تصوف میں عشق حقیقی تک رسائی کے لیے ایک زینے کا کام دیتا ہے۔ اسی طرح مادی حُسن ایک ایسا آئینہ ہے، جس میں صوفی کو حُسنِ ازل کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو اسے بے قرار کرتی ہے۔ وزیر آغا لکھتے ہیں:

> حسنِ ازل کے بارے میں دو باتیں بالکل واضح ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ حسنِ ازل روشنی کا ایک کوندا اور تجلّی کی ایک لپک ہے گویا یہ حُسن، آواز اور صورت کی بجائے روشنی سے عبارت ہے۔ .... دوسرا یہ کہ دنیا میں جہاں کہیں حسن ہے چاہے وہ اشیا، پرندوں، سبزہ زاروں اور ندیوں ہی کا حُسن کیوں نہ ہو، دراصل حُسنِ ازل کا عطیہ ہے۔[۷]

تصوف میں پہلا درجہ حُسن کے ظہور کا ہے جو محبوب کے سراپا کو دیکھ کر عاشق کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور پھر اسے اتنا بے قرار کرتا ہے کہ وہ بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے۔ اگر یہ کشش محض جسم کی سطح تک رہے تو جنسی کشش کہلائے گی لیکن جب اس جذبے کی تہذیب ہو جاتی ہے تو یہ محبت کا عنوان پاتا ہے اور دلوں کی ہم آہنگی کا باعث بنتا ہے۔ لیکن جب اس جذبے میں اتنی شدت پیدا ہو جائے کہ محبوب کی ذات کے علاوہ کچھ باقی نہ رہے تو عشق کہلاتا ہے اور پاکیزگی کی لطافت میں تبدیل ہو کر حیاتِ دوام حاصل کرتا ہے۔ تصوف کے باب میں عشق کسی مادی محبوب کے سراپا سے مربوط نہیں کیونکہ صوفی کی نظر مادی حُسن کے پردے سے گزر کر حُسنِ ازل کی تجلی تک پہنچتی ہے۔ لیکن اپنے مزاج اور کارکردگی کے حوالے سے یہ جذبہ عام انسان کو مادی عشق ہی سے مشابہ نظر آتا ہے اور صرف صاحبِ نظر ہی اس کی حقیقت کا ادراک کر سکتے ہیں۔ اسی عشق کی بدولت صوفی روحانی ارتقا کا سفر طے کرتا ہے اور پھر اپنے فنِ سخن گوئی کی بدولت اسے

دوسرے انسانوں تک پہنچانے کا فریضہ بھی بخوبی سرانجام دیتا ہے۔ یہ فن ہی ہے جو معرفت کے نازک اور لطیف اسرار و رموز کو اپنے دامن میں سمو لیتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے الفاظ میں:

صوفی خدا اور کائنات کے بارے میں جو علم حاصل کرتا ہے اسے وہ بآسانی دوسروں تک منتقل کر سکتا ہے اور تصوف کا فلسفیانہ پہلو اس انتقالِ علم ہی کا مظہر ہے لیکن جب صوفی حُسنِ ازل کی تجلیات سے آشنا ہوتا ہے تو اس کے شخصی نوعیت کے انتہائی لطیف اور پُر اسرار تجربے کو صرف فن ہی گرفت میں لے سکتا ہے۔[۸]

فن کی آبیاری کے لیے خونِ جگر کی ضرورت ہے۔ خلوص نیت اور جذبۂ پیہم کے بغیر فن بے روح جسد کی مانند ہے۔ مسلسل محنت اور لگن ہی فن کو لازوال بناتی ہے:

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود[۹]
نقش ہیں سب ناتمام، خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر[۱۰]

علامہ اقبالؒ کے نزدیک فن وہی ہے جو حیات بخش اور زندگی کا ترجمان ہو، اس کے لیے خون جگر کی آمیزش ضروری ہے۔ میاں محمد بخشؒ بھی کمالِ فن کو عشق ہی کا معجزہ قرار دیتے ہیں۔ فن کار کے لیے ضروری ہے کہ وہ فن پارے میں تاثیر، گداز اور ابدیت کا رنگ بھرنے کے لیے سعیِ پیہم سے کام لے کیونکہ وارداتِ قلبی کا بیان صرف اسی صورت ممکن ہو سکتا ہے جب سوزِ عشق عروج پر ہو۔ لہٰذا دردِ دل اور سوزِ جگر ہی عاشق کی پہچان ہیں۔ شعلۂ عشق کی روشنی میں ہی عاشق معرفت کا سفر طے کرتا ہے:

زندگی کے دکھ درد شاعر کے دل میں انسانیت کے لیے ہمدردی، خلوص اور محبت کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ جب تک شاعر کے دل میں انسانیت کے درد کا سوز نہ ہو وہ زندگی کے اندھیروں میں اُجالا نہیں کر سکتا۔ محبت اور ہمدردی کی یہی تڑپ خود جل کر دوسروں کے لیے روشنی مہیا کرتی ہے۔ شاعر کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے وہ سوزِ قلب کا کرشمہ ہوتا ہے کیونکہ عشق ہی کی بدولت تخیلات و افکار کی دنیا میں آگ بھڑکتی ہے۔ میاں محمد بخشؒ کے نزدیک دردمندی ہی شاعر کی پہچان ہے:

جس وچہ رمز نہ ہووے درد منداں دے حالوں
بہتر چپ محمد بخشاؒ سخن اجیہے نالوں
جو شاعر بے پیڑا ہووے سخن اوہدے بھی رُکھے
بے پیڑے تھیں شعر نہ ہوندا اگ بن تہوں نہ تُکھے[۱۱]

شاعری کے لیے سوز و مستی بے حد ضروری ہے کیونکہ شاعر اپنے کلام سے دلوں میں پاکیزہ خیالات پیدا کرتا ہے اور قوموں کو نہ صرف زندہ کرتا ہے بلکہ ان کے اندر عمل کا ولولہ پیدا کرتا ہے۔ ایسی شاعری ہی

زندگی کی ترجمان ہوسکتی ہے جو مایوسی اور قنوطیت کے پردوں کو چاک کر کے زندگی کو امید کی روشنی سے ہم کنار کرے اور انسان کے باطن میں انقلاب پیدا کر دے۔ شاعری کا اصل مقصد زندگی کی اعلیٰ قدروں کا حصول اور حقائق تک رسائی ہے جو شاعری اس معیار پر پوری نہیں اترتی وہ مذموم ہے۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں: ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے، وہ نظر کیا! [۱۲]

علامہ اقبالؒ کے نزدیک شاعر قوم کا درد شناس ہوتا ہے وہ اپنی ہمدردی اور محبت سے ان کا مسیحا بن کر انھیں پستی سے بلندی کی طرف لے جاتا ہے اور ہر دم سرگرمِ عمل رہنے پر آمادہ کرتا ہے: ؎

شاعر اندر سینۂ ملت چو دل
ملتے بے شاعرے انبارِ گل! [۱۳]

میاں محمد بخشؒ بھی اپنے اشعار میں پوشیدہ فقر کے لطیف رموز کے بارے میں کہتے ہیں:

ہر بیتے وچہ رمز فقر دی جے تدھ سمجھ اندر دی
گل سُنا محمد بخشا عاشق تے دلبر دی [۱۴]

عشق ہی وہ حرکی قوت ہے جو عاشق صادق کو زمان و مکاں کی قیود سے آزاد کر کے قربِ الٰہی نصیب کرتی ہے۔ عشق کا باطنی پہلو نورانی ہے اور نور میں جمال ہے۔ عشق کی اصل نورِ رب العالمین ہے۔ میاں محمد بخشؒ کی مثنوی سفر العشق کا ہیرو سیف الملوک، پری بدیع الجمال پر عاشق ہوتا ہے جو نوری مخلوق ہے۔

گویا مجاز کے پردے میں میاں محمد بخشؒ نورِ حقیقی کے طلب گار ہیں اور یہی انسان کی اصل منزل ہے۔ لیکن اس منزل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے عشق اختیار کرنے کی ضرورت ہے اور عاشق بننا میاں محمد بخشؒ کے نزدیک آسان کام نہیں:

عاشق بنن سکھالا ناہیں ویکھاں نہیوں پتنگ دے
خوشیاں نال جلن وچہ آتش موتوں ذرا نہ سنگدے [۱۵]

ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

تصوف میں عشق کا سفر پروانے کے سفر کے مماثل ہے جو شمع کی روشنی کی ایک جھلک پانے پر شروع ہوتا اور اُس لمحے انجام کو پہنچتا ہے جب پروانہ خود کو شمع کی آگ میں جلا کر روشنی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ درمیانی مدارج میں سے ایک طواف ہے جس سے مراد یہ ہے کہ پروانے کا سفر دائرے میں طے ہوتا ہے اور جیسے جیسے طواف کی رفتار تیز ہوتی ہے عاشق اپنے وجود کے فاضل بوجھ سے دست کش ہوتا جاتا ہے۔[۱۶]

طواف دراصل ایک مخصوص دائرے میں دیوانہ وار مرکز کے گرد گردش ہے جسے خود فراموشی کی کیفیت کا رقص بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہی طواف عشق کی پہلی منزل ہے اور ارتکاز کی طرف پہلا قدم ہے:

تصوف کے بہت سے مسالک میں رقص کو اس لیے اہمیت ملی ہے کہ رقص جب اپنے عروج پر پہنچتا ہے تو انسان عقل وخرد کی قربانی پیش کرتا ہے۔ تاکہ اسے باریابی یا حضوری کی سعادت حاصل ہو سکے۔ ہندو دیومالا کے مطابق رقص ہی سے کائنات کی تخلیق ہوئی ہے، اس لیے کہ رقص سے خودفراموشی کا تسلط قائم ہوتا ہے اور خودفراموشی سے تخلیق کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ چونکہ یہ کائنات ایک عظیم تخلیقِ مُسلسل ہے، لہٰذا کچھ عجب نہیں کہ ایک بے پایاں خودفراموشی ہی اس تخلیق کا منبع ہو اور اس بے پایاں خودفراموشی کو قائم رکھنے کے لیے پوری کائنات رقص کر رہی ہو اقبال نے جس تغیر کے ثبات کا اقرار کیا ہے وہ کائنات کی مسلسل گردش ہی کا دوسرا نام ہے۔[۱۷]

سفر زندگی کے لیے برگ و ساز
سفر ہے حقیقت، حضر ہے مجاز
اُلجھ کر سلجھنے میں لذّت اسے!
تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے[۱۸]

ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں:

عشق دائرے میں گھومتا ہے اور ''محبوب'' کے گرد پروانہ وار طواف کرتا ہے۔ چنانچہ اقبال کے ہاں ایک طرف تو پوری کائنات ''مرکزِ عظمیٰ'' کے گرد بے پناہ رفتار کے ساتھ طواف کرتی ہوئی نظر آتی ہے، دوسری طرف مردِ مومن کائنات کی اس رفتار سے ہم آہنگ دکھائی دیتا ہے بلکہ وہ تو پوری کائنات کا اعلامیہ بن گیا ہے۔[۱۹]

میاں محمد بخشؒ رقص کے اس سفر کو عشق سے منسوب کرتے ہیں کیونکہ کوئی بھی گردش اُس وقت تک بے معنی ہے جب تک کسی مرکز ومحور کے گرد نہ ہو۔

چنانچہ فرماتے ہیں:

عشق نچاوے تھیّا تھیّا چھنکن پیریں سنگل
قید چھُٹے تاں اُس لکھ لُٹی ڈھونڈاں ندیاں جنگل[۲۰]

عشق کی قید سے رہائی پانا ناممکن ہوتا ہے کیونکہ عاشق کی حیثیت ایک جذباتی گردباد کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہے، جس کا مقدر مسلسل سفر اور تڑپ سے عبارت ہوتا ہے۔ یہ رقص جاں نہیں بلکہ روح کا رقص ہے۔ جو عاشق کا مقدر بن جاتا ہے اور وہ اس رقص کے ذریعے زمان ومکاں پر غالب آنے کی قوت حاصل کر لیتا ہے۔ بقول اقبالؒ:

رقصِ تن در گردش آرد خاک را
رقصِ جاں برہم زند افلاک را[۲۱]

ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

اقبال نے اپنی شاعری میں کائنات کے رقص کا بار بار ذکر کیا ہے۔ان کے نزدیک ہر ذرہ کائنات تڑپ رہا ہے، ہر شے متغیر ہو رہی ہے، ہر دم صدائے کن فیکوں آ رہی ہے اور ایک مسلسل سفر کی کیفیت ہر شے پر طاری ہے۔[۲۲]

انسانی عقل کُن کے ادراک کی رسائی سے یکسر قاصر ہے۔ عاقل، بالغ، عالم اور فاضل بھی اس راز کی حقیقت پانے سے قاصر ہیں۔میاں محمد بخشؒ کہتے ہیں

کُن اوہدی نوں کوئی نہ پہتا عاقل بالغ داناں
در جس دے سِر سجدے سَٹّے لوح قلم اسماناں [۲۳]

پوری کائنات آہستہ آہستہ منور ہو رہی ہے اور اسے تخلیقی آ گاہی حاصل ہو رہی ہے، یعنی اسے اپنی ہی آ گہی حاصل ہو رہی ہے۔ چونکہ آ گہی ہی تخلیق ہے، اس لیے ہر لحہ تخلیق کاری کا عمل جاری وساری ہے۔اسی نتیجے پر اقبالؒ بھی پہنچتے ہیں اور فرماتے ہیں:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کُن فیکوں [۲۴]

ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

تصوف میں عشق کا تصور دائرے سے نجات پا کر مرکز سے ہم رشتہ ہونے کا عمل بھی ہے اور اس لحاظ سے سراسر تخلیقی ہے مگر دائرے کے زندان سے عشق کی جست سیدھی لکیر اختیار کرنے کا ایک بالکل عارضی منظر ہے، کیونکہ اس کے فوراً ہی بعد عاشق ''مرکزہ'' میں تحلیل ہو جاتا ہے۔[۲۵]

گویا عاشق زندگی اور موت کے مرحلے سے گزرتا ہے اور اپنی بقا کے لیے جست لگا کر حُسنِ ازل سے وابستہ ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ زمین و آسمان کی وسعتیں اُس کے جذبۂ عشق کے سامنے سمٹ جاتی ہیں اور وہ ان پر غالب آ جاتا ہے:

عشق کی اِک جست نے طے کر دیا قصّہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں [۲۶]

میاں محمد بخشؒ کے نزدیک عشق کا سفر حیات بعد الممات کا سفر ہے اس لیے عاشق آگ کا یہ دریا بے خوف و خطر عبور کر لیتا ہے۔ اُس کے نزدیک یہ موت عارضی ہے جس میں خاکستر ہونے کے بعد ایک نئی اور روشن زندگی کی صبح طلوع ہوتی ہے۔ بڑے بڑے عقل منداور دانش ور اس پُل کے سفر کو دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتے ہیں لیکن عشق ہی وہ جذبہ ہے جو عاشق کو ہر خوف، غم اور مصیبت سے نجات دلا کر منزل مقصود تک پہنچاتا ہے۔ یہ زندگی کو پُر جوش، باعمل اور طاقتور بنا دیتا ہے۔میاں محمد بخشؒ فرماتے ہیں:

کی کجھ بات عشق دی دساں قدر نہ میرا بھائی
ایہہ دریا اگّی دا وگدا جس دا لاہنگ نہ کائی

جس نے قدم اگیرے دھریا سویو سڑیا سڑیا
پر ایتھے سڑ مرن حیاتی اینویں گل نہ اڑیا[۲۷]

عاشق صادق مرنے سے ہرگز نہیں ڈرتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ موت عشق کو فنا نہیں کر سکتی۔ عشق کا جوہر غیر فانی ہے۔ اس لیے عشق میں حیل و حجت اور پرہیز کا کوئی کام نہیں۔ میاں محمد بخشؒ کے نزدیک عشق جرأتِ رندانہ سے عبارت ہے:

چھم چھم تیر پوّن تلواریں عاشق ناں ڈر رہندے
عشق پرہیز محمد بخشا نہیں کدے رل بہندے[۲۸]

علامہ اقبالؒ کے نزدیک عشق فتح یاب ہے۔ وہ مقصد کے حصول سے ایک لمحہ کے لیے بھی غفلت شعاری کا مظاہرہ نہیں کرتا بلکہ ہر قسم کے شکوک وشبہات سے دامن چھڑا کر نصب العین کو گرفت میں لے آتا ہے:

عقل در پیچاکِ اسباب و علل
عشق چوگاں بازِ میدان عمل[۲۹]

جرأتِ رندانہ کی نعمت صرف عشق کو ہی حاصل ہوتی ہے کیونکہ عشق راستے کی تکالیف کو خاطر میں نہیں لاتا اور نصب العین کے حصول کی جانب سفر جاری رکھتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک عقل اور عشق دونوں ہی سالارِ قافلہ ہیں اور منزل تک پہنچانے میں معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اقبالؒ عقل کی مخالفت نہیں کرتے لیکن اس کی حدود اور عجز سے باخبر ہیں کیونکہ عقل کی خامی یہ ہے کہ وہ شک میں مبتلا ہوجاتی ہے اور پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہے جبکہ عشق کی اساس یقین پر ہے جس کے سامنے ہر ممکن اور موجود شے شکست کھا جاتی ہے۔ گویا عشق ایک سیلاب کی مانند ہے جو راستے کے تمام خس و خاشاک کو بہا کر لے جاتا ہے۔ جس طرح خوشبو کو قید نہیں کیا جا سکتا اسی طرح عشق کو گرفت میں لانا ناممکن ہے۔ میاں محمد بخشؒ فرماتے ہیں:

جھولی پاٗ انگار محمد کوئی پچا نہ سکے
عشقاں مشکاں تے دریاواں کون چھپائے ڈکے[۳۰]

عشق کی تڑپ، بے قراری اور لگن لمحہ بہ لمحہ انسان کو سرگرم عمل رکھتی ہے اور یہی سعیِ پیہم منزل تک پہنچنے کے لیے سازگار ثابت ہوتی ہے۔ گویا راہ عشق کے مسافر کے لیے صبر و قرار ناممکن ہے۔

عقل ہر شے کو شعور و ادراک کی کسوٹی پر پرکھتی ہے اور صبر کے ساتھ منزل تک رسائی کی متقاضی ہے اس لیے جرأت رندانہ سے عاری ہے:

ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

اقبال نے اپنی شاعری میں عقل کو اسباب و علل کے تابع قرار دینے کے علاوہ ایک خوف زدہ، پھونک پھونک کر قدم رکھنے والی ہستی کے روپ میں دیکھا ہے۔ ایک ایسی ہستی جس کے ہاں جرأتِ رندانہ کی کمی ہے۔[۳۱]

عقل ہم عشق است و از ذوقِ نگہ بیگانہ نیست
لیکن ایں بیچارہ را آں جرأتِ رندانہ نیست [۳۲]

عقل کی مدد سے انسان خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ عالمِ روحانیت عقل کی گرفت سے باہر ہے۔ اس لیے علامہ اقبالؒ اسے منزل کی بجائے چراغِ راہ سمجھتے ہیں جو منزل کا راستہ دکھانے میں مددگار تو ثابت ہوسکتا ہے لیکن رازہائے درونِ خانہ سے بے خبر ہے:

خِرد سے راہرو روشن بصر ہے
خِرد کیا ہے؟ چراغِ رہگذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ رہگذر کو کیا خبر ہے! [۳۳]

نورِ حقیقی کو دیکھنے کے لیے جذبۂ عشق اور دلِ بینا کا ہونا ضروری ہے محض عقل اور فہم وفراست سے اس منزل تک حضوری ناممکن ہے:

میاں محمد بخشؒ فرماتے ہیں عقل کی تنگ دامنی عاشق ومعشوق کے مابین ہونے والے راز و نیاز کی وسعت کو نہیں سمیٹ سکتی کیونکہ یہ مرحلہ صرف عشق طے کرسکتا ہے جس نے یہ راز پالیا وہ سب سے زیادہ دانشمند ہے:

دور کِتے اس شہروں باہر پھردا عقل بے چارا
جس ایہ سِرّ ذرا ہِک لدھا ہر تھیں ہو یا نیارا [۳۴]

عشق ہی خلاّق اور فعال ہے محض عقل کی کیفیت انفعالی ہے۔ انسانی ارتقا میں جو قدم بھی اُٹھتا ہے وہ جذبۂ عشق کی بدولت اٹھتا ہے۔ عالم علم میں مست رہتا ہے اور عابد عبادت میں لیکن عاشق عشق کے اندر لمحہ بہ لمحہ نئے احوال پیدا کرتا ہے۔[۳۵]

علم بے عشق است از طاغوتیاں
علم با عشق است از لاہوتیاں [۳۶]

ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی لکھتے ہیں:

علامہ اقبال نے جس شدومد سے عشق کی مدح وستائش کی اور عقل کی مذمّت کی ہے، اس سے عام طور پر یہ دھوکا ہُوا ہے کہ وہ عقل کے یکسر مخالف ہیں حالانکہ ایسا سمجھنا بالکل غلط ہے۔ حضرت علامہ صرف یہ کہتے ہیں عقل یقین سے بے بہرہ اور ظن وتخمین میں ڈوبی ہوتی ہے۔ اس لیے اگر مگر اور تامّل وتذبذب کا شکار رہتی ہے اس کے برعکس عشق انجام کا اندیشہ کیے بغیر محبوب کے فرمان کے مطابق سبک گام عمل ہوتا ہے۔ اس لیے منزل پر پہنچ جاتا ہے اور عقل وہم وشک کے گرداب میں غوطے کھاتی رہ جاتی ہے۔[۳۷]

علامہ اقبالؒ عقل کی حدود سے آگے نکل جانے کے لیے اللہ تعالیٰ سے یوں دُعا کرتے ہیں:

خرد کی گتھیاں سُلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر![۳۸]

فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

اقبال کے نزدیک دانش کی دو قسمیں ہیں، ایک دانش برہانی دوسری دانش شیطانی۔ اگر علم وعقل باطنی شعور سے آگاہ نہ ہوں اور صرف جسم پروری کے کام کر رہے ہوں تو یہ دانش شیطانی ہے۔ اس کے برعکس اگر علم وعقل، روحانی حقائق سے آشنا ہوں اور منزل تک پہنچنے کا راستہ ہموار کر کے انسان کے دل میں اعلیٰ مقاصد کے لیے آرزو پیدا کرتے ہوں تو یہ دانش برہانی ہے اور اسی دانش برہانی کا دوسرا نام عشق ہے۔[۳۹]

جب انسان کی دانش میں اضافہ ہوتا ہے تو اُس پر اپنے جہل اور بے بصری کا راز بھی منکشف ہوتا ہے اور ہر قدم پر اس کی حیرت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے گویا پوری کائنات اس کے لیے حیرت کدہ بن جاتی ہے۔ حیرت کی یہی فراوانی منزلِ عشق ہے:

اک دانش نورانی، اک دانش برہانی
ہے دانش برہانی، حیرت کی فراوانی[۴۰]

عشق کی یہ منزل عرفان کی منزل ہے جہاں حیرت کا شیر گرج رہا ہے۔ عقل وفکر اس منزل کے ادراک سے عاجز ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ثنا بیان نہیں ہوسکتی:

اس میدان نہ چلّے گھوڑا شیتھ حیرت دا گجّے
خاص بلیٰ لَا اُحْصِیْ کہہ کے اس دوڑوں سن رجّے[۴۱]

میاں محمد بخشؒ نے حیرت کی اِس منزل کا ایک طویل نظم میں کیا ہے، اس کا پہلا شعر ہے:

فیر اگوں اک منزل آوے حیرت والی وادی
درد افسوس ہوئے گُم اوتھے ہرگز خوشی نہ شادی[۴۲]

عشق کے ساتھ ساتھ عقل بھی بہت ضروری ہے۔ اقبالؒ اور میاں محمد بخشؒ عقل کی اہمیت و افادیت سے ہرگز انکار نہیں کرتے بلکہ دیوانگی کے بعد جب اللہ تعالیٰ فرزانگی عطا کرتا ہے تو اس مرحلے پر میاں محمد بخشؒ فرماتے ہیں:

دانش عقل دِتّا رب مینوں سُکّی نہر وگائی
آوَ سَنگل لاہو میرے، وَلّ ہویا سودائی[۴۳]

علامہ اقبالؒ کی تعلیم یہ ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے انسان کو عشق کے ساتھ ساتھ عقل کی قوت سے بھی نوازا ہے۔ لہٰذا اس سے کام ضرور لیا جائے لیکن اسے راہنما نہ بنایا جائے کیونکہ زندگی کی اساس عقل نہیں بلکہ عشق ہے جو روحانی ارتقا کا ضامن بنتا ہے:

انسان تمام کائنات کو صرف اس لیے مسخر کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو عقل اور عشق کی قوتوں سے نوازا ہے عشق کی بدولت مومن کے لیے کوئی چیز ناممکن نہیں رہتی۔ مکاں اور لامکاں کی تمام وسعتیں اس کے زیرِ نگیں ہو جاتی ہیں۔

عقلِ آدم بر جہاں شبخوں زند
عشقِ او بر لامکاں شبخوں زند [۴۴]

یوسف حسین لکھتے ہیں:

اقبال عشق کو عقل کے مقابلے میں فضلیت دیتا ہے اس واسطے کہ اس سے حقائق اشیا کا مکمل علم اور بصیرت حاصل ہوتی ہے پھر یہ کہ انسانی زندگی میں جتنا اس کا اثر ہے عقل کا اثر اِس کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔[۴۵]

علم اور عقل انسان کو منزل کے قریب کرنے کے وسیلے ہیں لیکن منزل عطا نہیں کر سکتے۔ منزل پر پہنچنے کے لیے صاحبِ جنوں ہونا ضروری ہے۔

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ
کِسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک![۴۶]

میاں محمد بخشؒ عقل کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں کیونکہ جہالت کی تاریکی دُور کرنے کے لیے اُن کے نزدیک بھی عقل کی روشنی کی ضرورت ہے۔ عقل ہی منزل کا راستہ دکھا سکتی ہے کیونکہ یہ ایک چراغ ہے جو زندگی کی تاریک راہوں کو منور کرتا ہے۔ اس لیے وہ دعا کرتے ہیں:

لاہ ہنیرا جہل بُرے دا چانن لا عقل دا
بخش ولایت شعر سخن دی یُمن رہے وچہ رَلدا [۴۷]

اللہ تعالیٰ جب انسان کو عقل کی نعمت سے سرفراز کرتا ہے تو وہ ستاروں پہ کمند ڈالتا ہے اور اپنی عقل و دانش کی بدولت ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دیتا ہے جسے دیکھ کر دنیا دنگ رہ جاتی ہے۔ تسخیر کائنات کے لیے عقل قدم قدم پر راہنما بنتی ہے اور نت نئی تخلیقات میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے:

ہر خاکی و نوری پہ حکومت ہے خرد کی
باہر نہیں کچھ عقلِ خداداد کی زد سے [۴۸]

ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

اقبال نے خودی کو مختلف مفاہیم عطا کیے ہیں، ان کی روشنی میں صاف نظر آتا ہے کہ خودی وہ ثمر ہے جو مسافر کو ایک طویل تگ و دو کے بعد حاصل ہوتا ہے اور جس کے حصول کے بعد اس کا ایمان تازہ اور یقین پختہ ہو جاتا ہے۔[۴۹]

خودی کا اثبات عشق کے ذریعے ممکن ہو سکتا ہے اور اس کی تربیت بھی عشق پر ہی موقوف ہے۔ اقبالؒ

کے نزدیک خودی ایک روشن نقطہ ہے جو تمام تر طاقتوں اور قوتوں کا منبع و ماخذ ہے اس نقطے کی روشنی بھی عشق سے پیدا ہوتی ہے:

یوسف حسین لکھتے ہیں:

اقبال نزدیک انسانی مقاصد کی لگن بھی عشق ہے، تغیر و انقلاب کی خواہش بھی عشق ہے تہذیب نفس کی تخلیقی استعداد بھی عشق ہے اس نے مولانا روم کی طرح عشق کو عقل کا جزوی مدمقابل بنا دیا اور اس کی فضیلت و برتری طرح طرح سے ثابت کی۔[۵۰]

عشق سلطان است و برہانِ مبیں
ہر دوعالم عشق را زیرِ نگیں[۵۱]

خودی جب پختہ ہو جاتی ہے تو موت سے پاک ہو جاتی ہے موت کے دروازے سے گزر کر عاشق ایک ابدی اور حقیقی زندگی میں داخل ہوتا ہے اس لیے عاشق صادق موت سے نہیں ڈرتے۔ عشق کا خاصہ یہ ہے کہ وہ انسان کو غیر فانی بنا دیتا ہے۔ میاں محمد بخشؒ کے نزدیک:

عشقوں باہجہ ایمان کویہا کہن ایمان سلامت
مر کے جیون صفت عشق دی دم دم روز قیامت[۵۲]

اللہ تعالیٰ نے عشق کی جوگر انقدر نعمت انسان کو عطا کی ہے اُس نے انسان کو پیکرِ نوری سے بھی افضل و برتر بنا دیا ہے۔ اقبالؒ اور میاں محمد بخشؒ دونوں کو انسان کی اِس فضیلت و اہمیت کا پوری طرح ادراک ہے کہ فرشتے ذوقِ مہجوری سے محروم ہیں۔ عشق کی تپش اور سوز کی نعمت صرف انسان کو ہی ودیعت کی گئی ہے:

پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میّسر تو کیا
اس کو میّسر نہیں سوز و گدازِ سجود![۵۳]

میاں محمد بخشؒ فرماتے ہیں:

شان انسان جوان بھلے دا ملکاں نالوں اگے
کھول نئیں ایہ گل محمد مت کوئی جھگڑا لگے[۵۴]

انسان کی تخلیق کا اصل مقصد عبادتِ خداوندی ہے کیونکہ وہ صرف زبان سے ہی اطاعت نہیں کرتا بلکہ اپنی زندگی کے ہمہ گیر پہلوؤں میں بھی خدا کے احکامات کی پیروی کرتا ہے اور شریعت کی راہ پر چلنے کے لیے بے شمار تکلیفوں اور آزمائشوں سے بھی گزرتا ہے فرشتوں کا کام صرف تسبیح و تحلیل ہے جب کہ انسان عشقِ الٰہی کی بدولت بدی کی طاقتوں کا بھی مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔ گویا عشق کی بدولت وہ اپنے نفس پر قابو پاتا ہے اور احکاماتِ خداوندی بجالاتا ہے:

فرشتوں کے اندر فکر کی صلاحیت بھی موجود نہیں وہ تو صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کے پابند ہیں اور اپنے

علم و عقل سے کام لے کر حقائق تک رسائی حاصل کرنے سے بھی عاجز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عشق کے مقام تک پہنچنا فرشتوں کے بس کی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو حوصلہ اور جرأت کی بلندیوں سے نوازا ہے جس کی بدولت وہ عزم و ہمت سے کام لے کر ارتقا کی منزلیں طے کرتا چلا جاتا ہے۔

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انھیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد!۵۵

علامہ اقبالؒ کو انسان کا مقامِ بندگی بے حد عزیز ہے کیونکہ اس میں عشق کا سوز شامل ہے۔ یہی سوز اُسے منزلِ مقصود پر پہنچاتا ہے اور وہ قربِ الٰہی حاصل کر لیتا ہے۔

عبادت کی روح دراصل عشق ہے۔ عشق کے بغیر دل میں سوز و گداز پیدا نہیں ہوسکتا گویا خضوع و خشوع کے ساتھ عبادت کے لیے بھی ضروری ہے کہ دل عشق کی تڑپ اور سوز سے لبریز ہو۔

عشق کی بدولت انسانی روح قربِ الٰہی حاصل کرتی ہے۔ روحِ انسانی کی فطرت میں عشق کی آگ پوشیدہ ہے:

عشق اجہی اگ ہے جے دوزخ ویکھ سڑے
اس دے بھارے بھار تھیں تھر تھر عرش کرے۵۶

انسان ہی کائنات کی وہ عظیم اور معصوم ہستی ہے جس نے عشق کی اس نعمت کو عطیہ خداوندی سمجھ کر قبول کیا اور اپنے لیے مصیبتوں، تکالیف اور مشکلات سے پُر راستے کا انتخاب کر لیا۔ میاں محمد بخشؒ فرماتے ہیں:

بھار عشق دا کسے نہ چایا ہر ہر عذر بہانے
آکھ بلیٰ بلا سہیڑی انسانے نادانے۵۷

علامہ اقبالؒ کے نزدیک عشق کی یہی آگ مسلمان کا مقصدِ حیات ہے جو اسے حیاتِ ابدی سے ہم کنار کرتی ہے:

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے۵۸

خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:

عشق حسن سے پیدا ہوتا ہے اور پھر خود حسن آفرینی کرتا ہے۔ حسن و عشق ایک دوسرے کی علت اور معلول ہیں اقبال کے کلام میں عشق اور خودی کا مضمون جابجا ایک ہو گیا ہے۔ عشق کو خودی سے اور خودی کو عشق سے تقویت حاصل ہوتی ہے۔۵۹

عشق میں پختگی اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب مصلحت اندیشی بالکل ختم ہو جاتی ہے اور یقین کامل حاصل ہو جاتا ہے۔ پھر کبھی کبھی منزل خود بخود اچانک سامنے آجاتی ہے:

وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے
طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے
در طلب کوش و مدہ دامنِ امید زدست
دولتے ہست کہ یابی سرِ سراہے گاہے![۶۰]

میاں محمد بخشؒ فرماتے ہیں:

پکّا پیر دھریں جے دھرناں تلک نیں مت جاوے
سو اس پاسے بہے محمد جو سربازی لاوے[۶۱]

علامہ اقبالؒ نے عقل اور عشق کے بارے میں جو کچھ کہا وہ بنیادی طور پر رومؒی سے ماخوذ ہے۔ اپنے کلام میں بار بار رومیؒ سے فیض حاصل کرنے کا اعتراف کرتے ہیں:

قرآنِ کریم نے آفرینش آدم اور اعتراض ملائکہ کا جو قصہ بیان کیا ہے وہ آدم کے مسجود ملائک ہونے پر منتج ہوتا ہے۔ آدم کو وہ علم عطا کیا گیا جو ملائکہ کو حاصل نہ تھا اس وسعتِ علم کی بدولت آدم ملائکہ سے افضل قرار پایا، لیکن علم کے ساتھ ہی آدم کا طالب عفو ہونا اور خدا کی طرف رجوع کرنا عشق کی بدولت تھا۔ اس لیے عارف رومی محض علم کو نہیں بلکہ عشق کو آدم کی امتیازی خصوصیت قرار دیتا ہے۔ خالی علم زیرکی پیدا کرسکتا تھا جو ابلیس کی صفت ہے، عشق اس سے الگ چیز ہے۔ عشق سے علم کی تکمیل ہوتی ہے لیکن رومی اور اقبال دونوں کے نزدیک آدم فوراً واصل باللہ نہیں ہوگیا بلکہ عشق کی بدولت اس پر ایک طویل مہجوری طاری ہوگئی۔[۶۲]

اقبالؒ کے نزدیک وصل الی اللہ کی منزل بہت دور ہے:

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں؟
کارِ جہاں دراز ہے، اب مرا انتظار کر![۶۳]

اس عشق کی کوئی ابتدا اور انتہا نہیں اور خود اقبالؒ بھی اس کی انتہا کے آرزومند نہیں ہیں کیونکہ اُن کے نزدیک زندگی ازل سے ابد تک جستجو سے عبارت ہے۔ اقبالؒ نے زندگی کو ہمیشہ جستجو اور آرزو ہی سمجھا اور وہ اس بات کے آرزومند رہے کہ یہ مرحلۂ شوق کبھی طے نہ ہو۔

خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:

اگر انسان کی خودی خدا سے الگ ہو کر فراق زدہ نہ ہوتی تو اس میں کوئی زندگی نہ ہوتی کیونکہ زندگی جستجو اور آرزو کا نام ہے اور آرزو کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں مقصود ایک لحاظ سے موجود ہوتا ہے اور دوسری حیثیت سے مطلوب ہوتا ہے۔ اگر انسان خدا کا عاشق ہوسکتا ہے تو فراق ہی کی بدولت ہوسکتا ہے۔ لیکن خدا کی ذات بھی تو عشق سے معرّا نہیں، عشق اس کی ماہیت میں بھی داخل ہے اس لیے حقیقت یہ ہے کہ ہم خدا کے لیے بے تاب ہیں اور خدا ہمارے لیے بے تاب ہے۔ اگر ہم اس سے الگ نہ ہوئے ہوتے تو وہ ہمارے لیے بے تاب کیسے ہوتا۔ فراق عشق کی فطرت میں داخل ہے اور یہی وجہ آفرینش ہے۔[۶۴]

خدا کا مقصود اپنی مخلوق میں عشق پیدا کرنا ہے اور عشق کا مقصود خود خدا ہے۔ اس لیے عشق کی بدولت انسان میں وہ بصیرت اور معرفت پیدا ہوتی ہے جس کی بدولت وہ خدا تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

عشق اس جوہرِ حیات کا نام ہے جو انسان کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے ودیعت کر رکھا ہے لیکن یہ مخفی و مستور ہوتا ہے اور صرف ذوقِ طلب سے متصّف ہو کر حقیقت مطلقہ کی جستجو کرتا ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصلِ او در آرزو پوشیدہ است[۶۵]

حُسن کو دیکھ کر دل میں پیدا ہونے والی پہلی خواہش کا نام آرزو ہے اور یہی آرزو محبت کا ایک اہم جزو ہے کیونکہ آرزو کے بغیر عشق کا وجود میں آنا ناممکن ہے۔ یہی آرزو جب شدت اختیار کرتی ہے تو عشق بن جاتی ہے۔ مقصد کے بغیر عمل ناممکن سی بات ہے کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہمارے دل میں آرزو یا خواہش پیدا ہوتی ہے اور پھر یہی آرزو یا خواہش انسان کو عمل پر آمادہ کرتی ہے۔ اگر آرزو نہ ہو تو کوئی عمل وجود پذیر نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے آرزو یا تمنا کو بھی بڑی اہمیت دی ہے کیونکہ آرزو تخلیق کو بنیاد فراہم کرتی ہے۔

علامہ اقبالؒ کے نزدیک خودی کے استحکام کے لیے تعمیر و تخلیق کی بہت اہمیت ہے کیونکہ یہی قوت تسخیرِ کائنات کا سبب بنتی ہے۔

زندگی ہر لمحہ عمل کی متقاضی ہے کیونکہ انسان کے اعمال ہی اُسے منزلِ مقصود تک پہنچاتے ہیں۔ عمل کے بغیر زندگی میں حرکت و توانائی ممکن نہیں جس زندگی میں انقلاب نہ ہو وہ زندگی موت ہے۔ زندگی ترقی کے راستے پر عمل کی بدولت ہی رواں دواں رہتی ہے۔

عشق کا یہی وہ اعلیٰ و ارفع جذبہ ہے جو بلند نصب العین کے حصول کے لیے انسان کو اپنا سب کچھ قربان کر دینے پر تیار کرتا ہے اس لیے صرف یہی زندگی کی دلیل ہے:

عشق ایک سیلاب کی مانند ہے اور اس کے کئی راستے ہیں یہ خفیہ راستوں سے سینے میں جاگزیں ہو جاتا ہے اس کو روکنا محال ہے۔ عشق مختلف جلووں میں تجلی ریز ہوتا ہے اور انسان کے پیکر میں زندگی کی حرارت پیدا کرتا ہے۔ اسی کے دم قدم سے زندگی ہے۔ عشق زندگی کا جوہر اور روح ہے۔ میاں محمد بخشؒ فرماتے ہیں:

عشقے دے کئی راہ نیں، ناہیں اکھیں بس
جاندا ہر ہر سینہ تھیں چوراں وانگن دھس[۶۶]

بقول اقبالؒ:

تُند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رَو
عشق خود اک سیل ہے ، سیل کو لیتا ہے تھام[۶۷]

عشق کی ابتدا حُسن ہے، اور حُسن خلاّقِ آرزو ہے۔ آرزو وہ خواہش ہے جو انسان کو زندگی میں بلند نصب العین کے حصول کی جانب کشاں کشاں لے جاتی ہے اور بالآخر کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے۔ اس لیے علامہ اقبالؒ آرزو کو دل سے کبھی جدا نہیں کرتے کیونکہ آرزو ہی جستجو پر آمادہ کرتی ہے اور انسان کو پُر اُمید بناتی ہے۔ اُمید زندگی کی علامت ہے جبکہ نا اُمیدی اور یاسیت موت ہے۔

اقبال کے ہاں آرزو سے انسان کے خون میں گرمی پیدا ہوتی ہے اور اسی سے زندگی کی شمع روشن رہتی ہے۔ یہ افعال کی شیرازہ بندی کرتی ہے اور مقاصد پر کمند ڈال کر ان کا شکار کھیلتی ہے۔ اسی کی بدولت انسان تسخیر کائنات کی راہوں پر رواں دواں رہتا ہے اور منزل کے حصول تک سفر جاری رہتا ہے۔ یہ آرزو ہی ہے جو انسان کو جستجو کے راستے پر گامزن کرتی ہے اور پھر ہر لمحہ اس کے ساتھ رہتی ہے:

زندگی مضمونِ تسخیر است و بس
آرزو افسونِ تسخیر است و بس
زندگی صید افگن و دام آرزو
حسن را از عشق پیغامِ آرزو[۶۸]

آرزو ہی وہ انسانی قوت ہے جو قلب کو فعال اور متحرک رکھتی ہے اور انسان کو جستجو اور تحقیق پر آمادہ کرتی ہے:

کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دل میں آرزو اور لگن کا ہونا ضروری ہے یہی آرزو انسان کو بلند نصب العین کے مقصد کے حصول کے لیے عمل پیہم پر آمادہ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ نے آرزو یا تمنا کو عشق کی اساس قرار دیا ہے۔ آرزو کے بغیر زندگی محال ہے بلکہ یہ دنیا خواہشات اور تمناؤں کی بدولت ہی خوبصورت اور رنگین ہے۔ آرزو انسان کے ساتھ ہر وقت رہتی ہے بلکہ لہو میں گردش بن کر دوڑتی ہے۔ آرزو کی موت مایوسی اور نا اُمیدی پیدا کرتی ہے۔ اقبالؒ اور میاں محمد بخشؒ کے کلام میں یاسیت اور نا اُمیدی کی بجائے قوت اور ہمت کا درس پایا جاتا ہے جو آرزو ہی کا مرہونِ منت ہے:

سنگِ رہ آب است اگر ہمت قوی است
سیل را پست و بلندِ جادہ چیست
سنگِ رہ گردد فسانِ تیغِ عزم
قطعِ منزل امتحانِ تیغِ عزم[۶۹]

میاں محمد بخشؒ فرماتے ہیں:

رکھ دلیری کریں نہ جھورا مت قوت گھٹ جائے
مرداں دے سر بنن قضیّے اوڑک پہچن جائے
جھورا فکر گھٹاندا قوت نالے نور عقل دا
ٹدّھ پر کم اجے کئی بھارے ہار نہ جاویں چل دا[۷۰]

علامہ اقبالؒ کا تصورِ عشق دوسرے شعرا کے رسمی عشق سے قطعاً مختلف ہے۔ اقبالؒ نے عشق کو بہت اعلیٰ و ارفع اور وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ عشق و جنوں مقصد سے بے پایاں لگن اور محبت کا نام ہے کیونکہ جب تک دل میں کسی مقصد کے حصول کی تڑپ، دیوانگی اختیار نہ کر جائے مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ یہی لگن انسان کو لحہ بہ لحہ قوت اور توانائی عطا کرتی ہے اور اسی کی بدولت انسان راستے کی تمام مشکلات اور پریشانیاں عزم و استقلال اور خندہ پیشانی سے برداشت کرتا چلا جاتا ہے۔ جس قدر اس کا مقصد بلند ہوتا ہے اسی قدر طاقت اور ہمت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اسی لیے اقبالؒ کے ہاں عشق ذوقِ تسخیر کا نام ہے جو انسان کو لحہ بہ لحہ عمل پر آمادہ کرتا ہے:

عشق شبخونے زدن بر لامکاں
گور را نادیدہ رفتن از جہاں![۱۷]

میاں محمد بخشؒ فرماتے ہیں:

عشق زور آور شیر شکاری اس دا ہاڑ نہ خالی
چھیڑ کھیڑ نہ کریئے مارے انگل جس دسالی
کوئی ہتھیار نہ پوہندا اُس نوں ناں پھٹ لگدا کاری
مار اپنا چھڈ جاندا ناہیں چڑیا کرے خواری[۴۲]

فقر بھی عشق کا ہی ایک روپ ہے اس لیے اس میں وہ تمام قوتیں پائی جاتی ہیں جو عشق کے فیضان سے حاصل ہوتی ہیں۔ یہ فقر کا ہی کمال ہے کہ وہ بندے کو مقامِ عبودیت پر فائز کرتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جب ساری کائنات صاحبِ فقر کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہے لیکن وہ ان سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اس کا ہر عمل صرف محبوبِ خدا کی خوشنودی اور رضا کے لیے ہوتا ہے۔ میاں محمد بخشؒ کے نزدیک عشق کی یہی اکمل ترین صورت ہے جب عاشق محبوب خدا کی وحدانیت کا اقرار کرتے ہوئے خدا کی صفت بے نیازی کو اپنے اندر جذب کرتا ہے اور اللہ کے سوا ہر چیز کا خیال دل سے نکال دیتا ہے تو یہ کامل عشق سالک کو بے پایاں غیبی طاقت عطا کرتا ہے۔

اسی لیے میاں محمد بخشؒ اللہ تعالیٰ سے دُعا فرماتے ہیں:

کامل عشق خدایا بخشیں غیر ولوں مکھ موڑاں
ہکو جاناں ہکو تکّاں ہکو آکھاں لوڑاں![۴۳]

بقول اقبالؒ:

مَاسوا اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست[۴۴]

غیر اللہ کی غلامی سے نجات کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے کامل عشق کا طالب ہو کیونکہ مسلک عشق اختیار کرنے سے ہی انسان غیر اللہ کی غلامی سے رہائی پا سکتا ہے۔ اور اُس کا مقصدِ حیات صرف اللہ تعالیٰ بن جاتا ہے۔ جب عشقِ الٰہی کامل ہو جاتا ہے تو خدا بھی اُس سے محبت کرنے لگتا ہے اور وہ انسان مقامِ محبوبیت حاصل کر لیتا ہے۔ یعنی نفسِ انسانی حقیقت کلی کا عکس مکمل طور پر اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

رنگِ او برکن مثالِ او شوی
در جہاں عکسِ جمالِ او شوی[۷۵]

گویا انسان میں خدا تعالیٰ کی صفات منعکس ہو جاتی ہیں اور وہ کُلّی طور پر خدا تعالیٰ کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جب اُس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ بن جاتا ہے اور اُس کی ہستی خدا کی ذات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

عشق کی معراج یہ ہے کہ عاشق محبوب کے رنگ میں پوری طرح رنگ جائے اور وہ صرف محبوب کی رضا میں راضی ہو۔ اس کا ہر فعل اور عمل محبوب کی مرضی و منشا کے مطابق سرزد ہو۔ یہی ایمانِ کامل کی شرط ہے۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

قلب را از صبغۃ اللہ رنگ دہ
عشق را ناموس و نام و ننگ دہ[۷۶]

پروفیسر محمد منور لکھتے ہیں:

گویا صبغۃ اللہ (اللہ کا رنگ) اختیار کرنے والا بھی نُور ہی کا مظہر ہوتا ہے۔ جس قدر صبغۃ اللہ زیادہ، اسی قدر نور زیادہ، بصیرت زیادہ، دانش زیادہ، فہم وشعور زیادہ۔ پھر عالمِ نورانی کیوں دکھائی نہ دے پھر یہ امر بھی واضح ہے کہ خدائی صفات کا انسانی پَرتو کامل بلکہ اکمل تو حضور نبی اکرمؐ ہی کی ذات ہے، چنانچہ نبی اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ اختیار کیے بغیر اخلاق الٰہیہ کا اسلوب اپنایا نہیں جا سکتا۔[۷۷]

میاں محمد بخشؒ فرماتے ہیں:

رستہ چھوڑ نبی دا ٹُریاں کوئی نہ منزل پُگدا
جے لکھ محنت ایویں کریئے کلّر کول نہ اُگدا
رستہ صاف نبی دے پچھّے ہور نہ جانو کوئی
اوہو کرے شفاعت ساڈی تاہئیں مِلسی ڈھوئی[۷۸]

مسلمان کے لیے اِتباعِ رسولؐ اور تقلید نبویؐ اولین شرط ہے یعنی سُنت نبوی میں ڈوب کر خود شناسی حاصل کرنا ہی مومن کی شان ہے۔ یہی وہ مقام ہے جب حضورؐ کے تمام کمالات کا عکس مومن کی ذات

سے منعکس ہونے لگتا ہے۔ علامہ اقبالؒ مومن کو فنا فی الرّسولؐ کی منزل تک پہنچنے کا درس دیتے ہیں کیونکہ آپ کی ذاتِ مبارک ہی اصل دین ہے۔ اگر کوئی اس منزل تک نہیں پہنچتا تو وہ اسلام سے دُور ہے اور اس کی تمام تگ و دو بولہبی ہے:

بمنزل کوش مانندِ مہِ نَو
دریں نیلی فضا ہر دم فزوں شَو
مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفیؐ رو[۷۹]

علامہ اقبالؒ سچے عاشق رسولؐ تھے آپ کی طبیعت میں اس قدر سوز و گداز تھا کہ جب کبھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک ہوتا تو آپ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہو جاتے۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک خودی کی معراج عشقِ رسولؐ ہی ہے۔ گویا اقبالؒ کی تعلیمات کا خلاصہ اور لب لباب اِتباع رسولؐ ہے اور یہی راہ نجات ہے۔

میاں محمد بخشؒ فرماتے ہیں یہ عشق کا ہی معجزہ ہے کہ راہِ طلب میں امامِ حسنؓ اور امام حسینؓ نے اپنے تن بدن پر خنجر کے وار جھیلے اور اُف تک نہ کی کیونکہ وہ حُسنِ حقیقی کے عاشق زار تھے اس لیے شہادت سے سرفراز ہوئے:

میاں محمد بخشؒ کے نعتیہ کلام کی عظمت سے اندازہ ہوتا ہے کہ عشق کی معراج ان کے نزدیک فنا فی الرّسولؐ کا مرتبہ ہے۔ وہ شاعرِ آتش بیاں اور ولی کامل ہونے کے ساتھ ساتھ سچے عاشقِ رسولؐ بھی تھے اُن کی تصنیف تحفۂ رسولیہ میں اُن کے فکری دلائل انسان کی راہنمائی کے لیے نبوت کی ضرورت و اہمیت کا احساس دلاتے ہیں۔ نبوت کی اہمیت اُجاگر کرنے کے لیے میاں صاحبؒ نے انبیائے کرامؑ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات وضاحت وصراحت کے ساتھ پیش کیے اور ہدایت سے متعلق قرآنی آیات کی تفسیر بیان کی ہے۔ ڈاکٹر غلام حسین اظہر کے مطابق:

> میاں صاحب نے انھی قرآنی معارف پر اپنے استدلال کی بنیاد استوار کی ہے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ جس نے ہمیں جسمانی لوازمات سے نوازا ہے اس نے ہماری رہبری اور راہنمائی کا سامان بھی مہیا کیا ہے۔ یہ رہبری ہمیں نبوت کی صورت عطا کی گئی ہے۔ حواس، وجدان اور عقل جس منزل پر رک جاتے ہیں وہاں نورِ نبوت ہماری راہنمائی کرتا ہے۔[۸۰]

میاں صاحبؒ نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو سیرت نگاری کے لیے وقف کر دیا تھا۔ آپ پورے دو برس تک سیرت کے مطالعہ میں منہمک رہے۔ آپ کا نعتیہ کلام رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی عقیدت اور محبت کا بے پایاں ثبوت ہے۔ آپ کی نعتیہ شاعری کا ایک ایک لفظ محبت و احترام کی چاشنی میں ڈوبا ہوا ہے۔ میاں صاحبؒ کی حُبِ رسولؐ کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی ہر تصنیف کے آغاز میں حمد باری تعالیٰ کے بعد حضورؐ کی بارگاہ عقیدت میں ہدیۂ نعت پیش کیا ہے:

میاں محمد بخشؒ کے اسی عشقِ رسولؐ کی عقیدت میں ڈوبے لہجے کی مٹھاس اور محبت و احترام کے جذبات نے انھیں یہ کہنے پر مجبور کیا۔

میاں محمد بخشؒ اور علامہ اقبالؒ کے نعتیہ کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ دونوں تعلق بالرسالت پر زور دیتے ہیں اور بارگاہ نبوت کو ہی ہر طرح کے فیضان کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔ کیونکہ جس خوش قسمت کو آپؐ کی محبت نصیب ہو گئی اُس کو دنیا اور آخرت میں فلاح نصیب ہو گئی۔ مزید یہ کہ تسخیرِ کائنات کا جیسا عظیم کام بھی عشقِ رسولؐ کے بغیر ناممکن ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

می ندانی عشق و مستی از کجاست؟
ایں شعاعِ آفتابِ مصطفیؐ ست [۸۱]

اسی مقام فنائیت سے علامہ اقبالؒ جب کائنات پر نظر ڈالتے ہیں تو انھیں اِس پوری کائنات میں ہر طرف حضور اکرمؐ کے جلوے بکھرے نظر آتے ہیں اور حضورؐ کی ذات ایک ایسے بحرِ ذخّار کی مانند نظر آتی ہے جس سے کائنات کی ہر شے سیرابی حاصل کر رہی ہے۔

میاں محمد بخشؒ بھی حضور اکرمؐ سے عقیدت کا اظہار ایسے ہی الفاظ میں کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپؐ کا نورِ مبارک اُس وقت بھی روشن تھا جب آدمؑ کا خمیر بھی نہ بنا تھا۔ آپؐ ہی اوّل اور آپؐ ہی آخر ہیں۔ دنیا کے تمام نور آپؐ کی ذاتِ مبارکہ کے باعث ہیں جبکہ آپ کے نور کا تعلق براہِ راست اللہ تعالیٰ کے نور کے ساتھ ہے کیونکہ آپؐ کو معراج کی رات نصیب ہوئی۔ اللہ تعالیٰ طٰہٰ اور یٰسٓ کہہ کر آپؐ کی صفات بیان کرتا ہے:

سخن نئیں کوئی ہوندا میں تھیں تیری شان قدر دا
طٰہٰ تے یٰسٓ الٰہی صفت تساڈی کردا [۸۲]

اللہ تعالیٰ نے حضور اکرمؐ کی بعثت کو عالمِ انسانیت کے لیے احسانِ عظیم قرار دیا کیونکہ اطاعتِ رسولؐ اطاعتِ الٰہی کے مترادف ہے۔ قرآن مجید میں سنتِ رسولؐ کی پیروی اور اسوۂ حسنہ کے اِتباع کی بار بار تاکید کی گئی ہے۔ عشقِ رسولؐ مومن کے لیے محبت کی معراج ہے۔ علامہ اقبالؒ اور میاں محمد بخشؒ کے نزدیک عشق کا یہی کامل اور اکمل ترین درجہ ہے۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

لوح بھی تُو ، قلم بھی تُو ، تیرا وجُود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حَباب! [۸۳]

میاں محمد بخشؒ فرماتے ہیں:

لوح قلم آساناں زمیاں دوزخ جنت تائیں
کرسی عرش معلّٰی ویکھیں سیر کریں سبھ جائیں [۸۴]

یہ عشقِ رسولؐ ہی تھا جو علامہ اقبالؒ کی رگ رگ میں سرایت کر چکا تھا اُن کا سارا کلام بھی عشقِ رسولؐ کا ہی معجزہ دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عشقِ رسولؐ کو دین و دنیا کا وسیلہ سمجھتے ہیں اور آپؐ ہی کی ذاتِ مبارکہ کو سرچشمہ حقیقت و مجاز کا درجہ دیتے ہیں۔ یہی عشقِ رسولؐ کا جذبہ اقبالؒ کی ساری زندگی میں جاری و ساری رہا اور ان کے نزدیک عشق کی معراج بنا جس سے زمانے میں اُجالا کیا جا سکتا ہے۔

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے[۸۵]

حوالے وحواشی

۱- ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم: فکرِ اقبال، ص ۲۵۸
۲- پروفیسر منور رؤف: دیدہ ور، ادارۂ تحقیق و تصنیف، پاکستان، طبع دوم، ۱۹۸۰ء، ص ۸۱
۳- محمد اقبال: کلیاتِ اقبال (اُردو) شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۳۸۷
۴- ایضاً، ص ۳۲۴
۵- میاں محمد بخش: سیف الملوك، ص ۵
۶- محمد اقبال: کلیات اقبال (اردو)، ص ۳۰۱
۷- ڈاکٹر وزیر آغا: تصوراتِ عشق و خرد اقبال کی نظر میں، اقبال اکادمی پاکستان، طبع سوم، ۱۹۹۴ء، ص ۱۷۰
۸- ایضاً، ص ۱۶۸
۹- محمد اقبال: کلیات اقبال (اردو)، ص ۳۸۷
۱۰- ایضاً، ص ۳۹۳
۱۱- میاں محمد بخش: سیف الملوك، ص ۲۷
۱۲- محمد اقبال: کلیات اقبال (اردو)، ص ۳۳۱، ۵۸۰، ۵۸۱
۱۳- محمد اقبال: کلیات اقبال (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۶۳۲
۱۴- میاں محمد بخش: سیف الملوك، ص ۲۲۷
۱۵- میاں محمد بخش: سیف الملوك، ص ۳۴
۱۶- ڈاکٹر وزیر آغا: تصوراتِ عشق و خرد اقبال کی نظر میں، ص ۲۲۷
۱۷- ڈاکٹر وزیر آغا: تصوراتِ عشق و خرد اقبال کی نظر میں، ص ۱۷۷، ۱۷۸
۱۸- محمد اقبال: کلیات اقبال (اردو)، ص ۴۱۸
۱۹- ڈاکٹر وزیر آغا: تصوراتِ عشق و خرد اقبال کی نظر میں، ص ۱۸۱
۲۰- میاں محمد بخش: سیف الملوك، ص ۸۰
۲۱- محمد اقبال: کلیات اقبال (فارسی)، ص ۷۹۶

۲۲- ڈاکٹر وزیر آغا: تصوراتِ عشق و خرد اقبال کی نظر میں، ص۱۷۸

۲۳- میاں محمد بخش: سیف الملوک، ص۶

۲۴- محمد اقبال: کلیات اقبال (اردو)، ص۳۲۰

۲۵- ڈاکٹر وزیر آغا: تصوراتِ عشق و خرد اقبال کی نظر میں، ص۱۶۴

۲۶- محمد اقبال: کلیات اقبال (اردو)، ص۳۱۰

۲۷- میاں محمد بخش: سیف الملوک، ص۳۴

۲۸- ایضاً، ص۳۶

۲۹- محمد اقبال: کلیات اقبال (فارسی)، ص۱۰۹

۳۰- میاں محمد بخش: سیف الملوک، ص۳۷۶

۳۱- ڈاکٹر وزیر آغا: تصوراتِ عشق و خرد اقبال کی نظر میں، ص۱۰۲

۳۲- محمد اقبال: کلیات اقبال (فارسی)، ص۴۱۸

۳۳- محمد اقبال: کلیات اقبال (اردو)، ص۳۷۷

۳۴- میاں محمد بخش: سیف الملوک، ص۴۰

۳۵- ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم: فکر اقبال، ص۲۲۴

۳۶- محمد اقبال: کلیات اقبال (فارسی)، ص۶۶۳

۳۷- ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی: اقبال اور محبت رسولؐ، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، طبع اوّل، ۱۹۷۷ء، ص۲۶

۳۸- محمد اقبال: کلیات اقبال (اردو)، ص۳۷۹

۳۹- فرمان فتح پوری: اقبال سب کے لیے، اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی، ۱۹۷۶ء، ص۲۶۳، ۲۶۴

۴۰- محمد اقبال: کلیات اقبال (اردو)، ص۳۱۱

۴۱- میاں محمد بخش: سیف الملوک، ص۹

۴۲- ایضاً، ص۴۱

۴۳- ایضاً، ص۸۳

۴۴- محمد اقبال: کلیات اقبال (فارسی)، ص۶۰۳

۴۵- یوسف حسین: خان، روح اقبال، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص۵۴

۴۶- محمد اقبال: کلیات اقبال (اردو)، ص۳۵۹

۴۷- میاں محمد بخش: میاں، سیف الملوک، ص۵

۴۸- محمد اقبال: کلیات اقبال (اردو)، ص ۵۰۱
۴۹- ڈاکٹر وزیر آغا: تصوراتِ عشق و خرد اقبال کی نظر میں، ص ۲۲۱
۵۰- یوسف حسین خان: اقبال کا تصور عشق، اقبال نامہ، ص ۲۱۷
۵۱- محمد اقبال: کلیات اقبال (فارسی)، ص ۶۱۰
۵۲- میاں محمد بخش: سیف الملوك، ص ۳۴
۵۳- محمد اقبال: کلیات اقبال (اردو)، ص ۳۸۷
۵۴- میاں محمد بخش: سیف الملوك، ص ۳۲۷
۵۵- محمد اقبال: کلیات اقبال (اردو)، ص ۳۰۰
۵۶- میاں محمد بخش: شیریں فرہاد، مکتبہ رضوان، میر پور، آزاد کشمیر، ۱۹۷۸ء، ص ۲۹
۵۷- میاں محمد بخش: سیف الملوك، ص ۳۲۷
۵۸- محمد اقبال: کلیات اقبال (اردو)، ص ۴۱۶
۵۹- ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم: فکر اقبال، ص ۲۸۷
۶۰- محمد اقبال: کلیات اقبال (فارسی)، ص ۳۹۴
۶۱- میاں محمد بخش: سیف الملوك، ص ۳۵
۶۲- ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم: فکر اقبال، ص ۲۷۳
۶۳- محمد اقبال: کلیات اقبال (اردو)، ص ۲۹۹
۶۴- ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم: فکر اقبال، ص ۳۹۹، ۴۰۰
۶۵- محمد اقبال: کلیات اقبال (فارسی)، ص ۱۵
۶۶- میاں محمد بخش: قصہ سوہنی مہینوال، ص ۴۸
۶۷- محمد اقبال: کلیات اقبال (اردو)، ص ۳۸۶
۶۸- محمد اقبال: کلیات اقبال (فارسی)، ص ۳۴
۶۹- محمد اقبال: کلیات اقبال (فارسی)، ص ۵۳
۷۰- میاں محمد بخش: سیف الملوك، ص ۳۱۹
۷۱- محمد اقبال: کلیات اقبال (فارسی)، ص ۶۱۰
۷۲- میاں محمد بخش: سیف الملوك، ص ۳۶۴
۷۳- میاں محمد بخش: سیف الملوك، ص ۱۲۵

۷۴- محمد اقبال: کلیات اقبال (فارسی)، ص ۱۱۱
۷۵- ایضاً، ص ۱۵۷
۷۶- محمد اقبال: کلیات اقبال (فارسی)، ص ۶۲
۷۷- محمد منور، پروفیسر: برہان اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، طبع اوّل، ۱۹۸۲ء، ص ۶۵
۷۸- میاں محمد بخش: سیف الملوک، ص ۹
۷۹- محمد اقبال: کلیات اقبال (فارسی)، ص ۶۵
۸۰- ڈاکٹر غلام حسین اظہر: میاں محمد بخش، ص ۱۲۴
۸۱- محمد اقبال: کلیات اقبال (فارسی)، ص ۸۶۴
۸۲- میاں محمد بخش: سیف الملوک، ص ۱۳
۸۳- محمد اقبال: کلیات اقبال (اردو)، ص ۴۰۵
۸۴- میاں محمد بخش: سیف الملوک، ص ۱۱
۸۵- محمد اقبال: کلیات اقبال، (اردو)، ص ۲۰۷